ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

غلام عباس کے افسانوں میں جنس نگاری کا تجزیاتی مطالعہ ("آنندی اور اس کی بیوی" کے تناظر میں)

نعمان گل
ایم فل اسکالر شعبہ اردو اسلامیہ کالج یونیورسٹی پشاور
Noman.khan4899.@gmail.com
بلال احمد
لیکچرار شعبہ اردو گورنمنٹ ڈگری کالج پبی نوشہرہ
University.uop@gmail.com
ذیشان خان
ایم فل اسکالر شعبہ اردو اسلامیہ کالج یونیورسٹی پشاور

Abstract
Ghulam Abbas presents the concept of sex not in its traditional, literal sense, but within a symbolic and social context. For him, sex is tied either to a woman's feminine consciousness and identity, or it reflects the compulsion and social oppression faced by a courtesan. He transcends the idea of mere physical gratification, imbuing the theme with deep emotional and social meaning. His uniqueness lies in his portrayal of the profound relationship between sex and human emotions. He masterfully delves into the internal complexities and helplessness of his characters. Consequently, his stories compel readers to contemplate, leaving a lasting impression through their emotional depth. This article analyzes these very aspects.

اردو ادب میں جنسیت کے موضوع کا ارتقائی سفر بنیادی طور پر تین مرحلوں میں منقسم ہے جو ادب کے فلسفیانہ مزاج، سماجی حقیقت نگاری اور نفسیاتی گہرائی کے امتزاج سے عبارت ہے۔ پہلا مرحلہ ادب کے اس بنیادی تصور سے جڑتا ہے کہ ادیب کا فرض محض سماجی اقدار کی پاسداری نہیں بلکہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو، خواہ وہ کتنے ہی پیچیدہ یا متنازعہ ہوں، متوازن اور جامع انداز میں پیش کرنا ہے۔ ادب اپنی فنی چابکدستی علامت نگاری اور استعارے کے ذریعے جنسیت جیسے حساس موضوع کو محض جسمانی عمل سے بلند کر کے محبت، ہجر، وصل، تنہائی اور وجودی جستجو کا استعارہ بنا دیتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ادب سماجی پابندیوں اور تنگ نظری کی حدود توڑ کر انسانی فطرت کے اس بنیادی پہلو کو نہ صرف معنی عطا کرتا ہے بلکہ اسے تہذیبی شعور کا حصہ بھی بناتا ہے۔

دوسرا مرحلہ اردو ادب کی اس روایت کی عملی تشکیل کا احوال ہے، جہاں سعادت حسن منٹو، رحمان مذنب اور عصمت چغتائی جیسے ادیبوں نے سماجی ٹیبوز کو چیلنج کرتے ہوئے جنسیت کو انسانی نفسیات اور سماجی ڈھانچے کی عکاسی کا ذریعہ بنایا۔ منٹو نے معاشرے کے منافقی بھرے چہروں کو بے نقاب کرتے ہوئے جنسیت کو ایک پیچیدہ سماجی حقیقت کے طور پر پیش کیا، جبکہ عصمت چغتائی نے خواتین کی جنسیت اور ان کی داخلی خواہشات کو نئے اسلوب سے بیان کر کے روایتی مردانہ بیانیے کو چیلنج کیا۔ ان ادیبوں کو شدید مخالفت اور مقدمات کا سامنا کرنا پڑا، لیکن ان کی جسارت نے ادب میں مکمل اظہار کی راہ ہموار کی اور ثابت کیا کہ جنسی موضوعات محض حسیاتی اظہار نہیں بلکہ سماجی، نفسیاتی اور تہذیبی حقائق کو اجاگر کرنے کا موثر ذریعہ ہیں۔ تیسرا اور سب سے اہم مرحلہ ممتاز مفتی اور قدرت اللہ شہاب کی فکری گہرائی میں ملتا ہے، جہاں انہوں نے جنسیت کے بیانیے کو فلسفیانہ اور روحانی سطح پر منتقل کیا۔ ان کے ہاں جنس محض جسمانی تفریح نہیں بلکہ انسانی نفسیات کی تہہ میں اترنے، تنہائی، خواہش اور وجودی بے چینی کو سمجھنے کا ذریعہ ہے۔ وہ جنسی تعلق کو دو وجودوں کے درمیان ہم آہنگی یا اس کی عدم موجودگی کی کہانی کے طور پر پیش کرتے ہیں، جہاں یہ عمل سماجی دباؤ، ممنوعات اور جذباتی تصادم سے ٹکراتا ہے۔ ممتاز مفتی نے علامتی اور تجریدی انداز میں جنسیت کو ایسا فلسفیانہ وسیلہ بنایا جو مادیت سے بلند ہو کر انسانی وجود کے اساسی جذبے کی تفہیم عطا کرتا ہے۔ اس طرح انہوں نے جنسیت کے بیانیے کو شرارت اور تفریح کے دائرے سے نکال کر اسے ہمارے شعور و لاشعور نفسیاتی تشکیل اور اجتماعی رویوں کا آئینہ دار بنا دیا جو اردو ادب میں ایک منفرد اور انقلابی تبدیلی ہے۔

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

غلام عباس کے افسانوں میں جنس کو محض لذت اور تفریح کا ذریعہ نہیں سمجھا گیا، بلکہ ان کے ہاں یہ موضوع گہری نفسیاتی اور معاشرتی پیچیدگیوں کے ساتھ ابھرتا ہے۔ ان کے کردار جب جنس کے معاملات سے دوچار ہوتے ہیں تو وہ آزادانہ انتخاب کی بجائے حالات کے ہاتھوں مجبور نظر آتے ہیں۔ یہ مجبوری کبھی معاشی تنگدستی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے، کبھی سماجی اقدار کی بھینٹ چڑھنے کی صورت میں، اور کبھی نفسیاتی الجھنوں کے روپ میں۔ اس طرح ان کے افسانوں میں جنس ایک ایسا پیچیدہ مسئلہ بن کر سامنے آتا ہے جو انسانی زندگی کے کئی پہلوؤں سے جڑا ہوا ہے۔

غلام عباس کے کرداروں کی جنسی زندگی کو دیکھیں تو وہ کبھی بھی خوشگوار اور پُرسکون نہیں ہوتی۔ ان کے مرد اور عورت کردار جنسی تعلقات میں مبتلا تو ہوتے ہیں لیکن اس عمل میں ان کے لیے لذت سے زیادہ ذہنی اذیت اور اخلاقی گراوٹ کا احساس نمایاں ہوتا ہے۔ یہ کیفیت انسانی فطرت کے اس المیے کو ظاہر کرتی ہے کہ انسان کس طرح اپنی فطری خواہشات اور سماجی مجبوریوں کے درمیان پھنس کر رہ جاتا ہے۔ ان کے ہاں جنسی تعلقات اکثر جرم، خوف اور پشیمانی کے احساسات سے جڑے ہوتے ہیں، جو قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ غلام عباس کے اس مخصوص زاویہ نظر کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ وہ اردو ادب کے اس دور میں لکھ رہے تھے جب جنس کو عموماً رومانوی انداز میں پیش کیا جاتا تھا۔ انہوں نے اس موضوع کی تلخ حقیقتوں کو بے نقاب کیا اور دکھایا کہ کس طرح معاشرتی ناہمواریاں، غربت اور جہالت انسان کی جنسی زندگی کو بھی متاثر کرتی ہیں۔ ان کا یہ نقطہ نظر آج بھی اتنا ہی متعلقہ ہے کیونکہ وہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ جنس محض ایک جسمانی عمل نہیں بلکہ انسانی وجود کا وہ حصہ ہے جو معاشرتی، اقتصادی اور نفسیاتی عوامل سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔

غلام عباس کے افسانوں (آنندی، حمام میں، اس کی بیوی، اور کن رس) میں کہیں کہیں جنس کا ذکر ملتا ہے۔ غلام عباس کے افسانے "آنندی" میں جنس نگاری کا سب سے نمایاں پہلو معاشرے کا وہ دوہرا معیار ہے جو عورت کے جسم کو کنٹرول کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ بلدیہ کے اجلاس میں زنانِ بازاری کو شہر بدر کرنے کی قرارداد پیش کی جاتی ہے اور ان عورتوں کے وجود کو "انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ" قرار دیا جاتا ہے۔ یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ ان عورتوں کے پاس آنے والے مرد حضرات پر کوئی سوال نہیں اٹھایا جاتا، نہ ان کے اخلاق کو پرکھا جاتا ہے۔ اراکین کی تقریروں میں جہاں ان عورتوں کو طلبہ کی ناکامی، شہر کی بڑھتی ہوئی جرائم، خاندانی نظام کی تباہی اور معاشرتی انحطاط کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے، وہیں ان مردوں کا ذکر تک نہیں کیا جاتا جو انہی عورتوں کے پاس جاتے ہیں، ان کے ساتھ وقت گزارتے ہیں اور ان کی معاشی سرپرستی کرتے ہیں۔ یہ انتخابِ نظری واضح طور پر ظاہر کرتا ہے کہ پدرشاہی معاشرہ اپنی تمام تر کمزوریوں اور ناکامیوں کا ذمہ دار عورت کو ٹھہرا کر خود بری الذمہ ہو جاتا ہے۔

> بلدیہ کا اجلاس زوروں پر تھا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور خلافِ معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہ تھا۔ بلدیہ کے زیرِ بحث مسئلہ یہ تھا کہ زنان بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے کیونکہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بد نما داغ ہے۔ بلدیہ کے ایک بھاری بھرکم رکن جو ملک و قوم کے سچے خیر خواہ اور دردمند سمجھے جاتے تھے، نہایت فصاحت سے تقریر کر رہے تھے، "اور پھر حضرات آپ یہ بھی خیال فرمائیے کہ ان کا قیام شہر کے ایک ایسے حصے میں ہے جو نہ صرف شہر کے بیچوں بیچ عام گزرگاہ ہے بلکہ شہر کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بھی ہے۔ چنانچہ ہر شریف آدمی کو چار و ناچار اس بازار سے گزرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں شرفاء کی پاک دامن بہو بیٹیاں اس بازار کی تجارتی اہمیت کی وجہ سے یہاں آنے اور خرید و فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔(۱)

افسانے کا سب سے اہم صنفی نکتہ یہ ہے کہ ان عورتوں کی اپنی کوئی آواز نہیں ہے۔ جب تک بلدیہ میں ان کی قسمت کا فیصلہ ہوتا ہے، اس وقت تک وہ مکمل طور پر خاموش ہیں۔ ان کے بارے میں فیصلے وہ مرد کر رہے ہیں جن میں ایک "پنشن یافتہ معمر رکن" بھی ہے جس کا مکان ان عورتوں کے بازار میں واقع ہے اور وہ ذاتی پریشانی کی بنا پر ان کی بے دخلی کا سب سے بھرپور حامی ہے۔ یہاں عورت محض ایک موضوعِ بحث ہے، ایک مسئلہ ہے، ایک چیز ہے جسے منتقل کیا جا سکتا ہے، جسے خریدنے اور بیچنے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ ان عورتوں کی جذباتی، نفسیاتی اور انفرادی حیثیت کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ بعد میں جب وہ اس فیصلے کے خلاف احتجاج کرتی ہیں تو انہیں نافرمان قرار دے کر جرمانے اور قید کی سزائیں دی جاتی ہیں، جو ظاہر کرتا ہے کہ اس معاشرے میں عورت کے لیے اپنی بات کہنے کی بھی گنجائش نہیں۔

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

> یہ مسئلہ کوئی مہینے بھر تک بلدیہ کے زیر بحث رہا اور بالآخر تمام اراکین کی اتفاق رائے سے یہ امر قرار پایا کہ زنان بازاری کے مملوکہ مکانوں کو خرید لینا چاہئے اور انہیں رہنے کے لیے شہر سے کافی دور کوئی الگ تھلگ علاقہ دے دینا چاہئے۔ ان عورتوں نے بلدیہ کے اس فیصلہ کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ بعض نے نافرمانی کر کے بھاری جرمانے اور قیدیں بھگتیں مگر بلدیہ کی مرضی کے آگے ان کی کوئی پیش نہ چل سکی اور چار و ناچار صبر کر کے رہ گئیں۔(۲)

جب ان عورتوں کو شہر سے چھ کوس دور ویرانے میں بھیج دیا جاتا ہے، تو جنس نگاری ایک نیا اور حیران کن رخ اختیار کرتی ہے۔ یہ عورتیں مایوس ہونے کے بجائے اس ویرانے کو آباد کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ وہ نہ صرف اپنے مکان بناتی ہیں بلکہ مسجد، دکانیں، اسکول، ہسپتال، بینک اور آخر میں ایک پورا شہر "آنندی" آباد کر دیتی ہیں۔ یہ منظر نامہ صنفی یوٹوپیا کی تخلیق ہے جہاں عورتیں نہ صرف اپنی معیشت کی مالک ہیں بلکہ وہ ایک مکمل تہذیبی ڈھانچہ بھی کھڑا کر رہی ہیں۔ جنس نگاری کے نقطہ نظر سے یہ بہت اہم ہے کہ جن عورتوں کو معاشرے نے سب سے نچلے درجے پر رکھا تھا، جنہیں "ناپاک" اور "بدنام" قرار دیا گیا تھا، وہ ایک پورے شہر کی معمار بن جاتی ہیں۔ یہاں مصنفہ نے یہ پیغام دیا ہے کہ عورت میں تخلیق کی لامحدود صلاحیت ہے، بشرطیکہ اسے مردانہ معاشرے کی دست اندازیوں سے آزاد کر دیا جائے۔

اس نئے شہر کی ترقی اور خوشحالی افسانے کے صنفی تجزیے کو مزید گہرا کرتی ہے۔ جو عورتیں پہلے اس بستی میں آنے سے انکاری تھیں، وہ اب اس کی ترقی دیکھ کر زمینیں خریدنے اور مکان بنوانے لگتی ہیں۔ شہر کے تاجر اور کاروباری افراد بھی اس بستی کی طرف رخ کرتے ہیں اور رفتہ رفتہ یہاں بجلی، ڈاک خانہ، تھانہ، سینما، ہوٹل اور بینک کھل جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ شہر کی آبادی ڈھائی لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ ترقی دراصل عورت کی معاشی آزادی اور خود مختاری کی علامت ہے۔ لیکن معاشرے کی ریاکاری کا عالم یہ ہے کہ جب یہ شہر پوری طرح آباد اور ترقی یافتہ ہو جاتا ہے، تو بلدیہ کا اجلاس پھر سے اسی مسئلے پر ہوتا ہے: زنانِ بازاری کو شہر بدر کیا جائے۔ یہ تاریخی تکرار بتاتی ہے کہ مردانہ معاشرہ عورت کی کامیابی اور خود مختاری کو کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔

افسانے کا آخری اور سب سے اہم صنفی نکتہ شناخت کی سیاست سے تعلق رکھتا ہے۔ بیس سال بعد اس شہر کا نام بدل کر "آنندی" رکھ دیا جاتا ہے، جو اس جگہ کا قدیم نام ہے۔ یہ نام کی تبدیلی دراصل ان عورتوں کی محنت، جدوجہد اور تخلیقی صلاحیتوں کو مٹانے کی ایک علامتی کوشش ہے۔ معاشرہ یہ تسلیم نہیں کرنا چاہتا کہ یہ شہر ان عورتوں نے آباد کیا تھا، بلکہ وہ اسے ایک تاریخی اور قدیمی شناخت دینا چاہتا ہے۔ اس طرح عورت کی تخلیقی صلاحیت کو نظر انداز کر کے اسے تاریخ سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ عصمت چغتائی نے اس افسانے میں یہ ثابت کیا ہے کہ پدرشاہی معاشرہ عورت کو دوہرے معیار پر پرکھتا ہے: ایک طرف وہ عورت کے جسم کو استعمال کرتا ہے اور اسے اپنی خواہشات کا آلہ بناتا ہے، دوسری طرف اسی عورت کو اپنی تمام تر سماجی برائیوں کا ذمہ دار ٹھہرا کر اسے معاشرے سے خارج کر دیتا ہے۔

> آنندی بلدیہ کا اجلاس زوروں پر ہے، ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے اور خلافِ معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہیں۔ بلدیہ کے زیر بحث مسئلہ یہ ہے کہ زنانِ بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے کیونکہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔ ایک فصیح البیان مقرر تقریر کر رہے ہیں، "معلوم نہیں وہ کیا مصلحت تھی جس کے زیر اثر اس ناپاک طبقے کو ہمارے اس قدیمی اور تاریخی شہر کے عین بیچوں بیچ رہنے کی اجازت دی گئی۔" اس مرتبہ ان عورتوں کے لیے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے بارہ کوس دور تھا۔(۳)

غلام عباس کا افسانہ "اس کی بیوی" جنس نگاری کے حوالے سے اہم ہے۔ اس افسانے میں جنس نگاری کا سب سے نمایاں پہلو مرد کی نظر (Male Gaze) کا غلبہ ہے، جو عورت کو مسلسل ایک شے اور دوسری عورت کا متبادل بنا کر پیش کرتا ہے۔ مرکزی مرد کردار نسرین کو کبھی اس کی اپنی شناخت میں نہیں دیکھتا، بلکہ ہمیشہ اپنی مرحوم بیوی نجمہ کے حوالے سے پرکھتا ہے۔ وہ اس کی آنکھوں، ٹھوڑی، بالوں اور گردن کو نجمہ سے تشبیہ دیتا ہے، گویا نسرین کا اپنا کوئی وجود ہی نہیں۔ یہ صورتحال نسرین کو شدید اضمحلال کا شکار کر دیتی ہے، چنانچہ وہ جمائیاں لینے، انگڑائیاں لینے اور بالآخر خاموشی اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ افسانے کا یہ حصہ معاشرے میں عورت کی انفرادی

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

شناخت کے فقدان اور مرد کی مسلط کردہ تصویر کے مطابق ڈھلنے کی مجبوری کو نمایاں کرتا ہے۔ نسرین کا یہ سوال کہ "یہ کیسا مرد ہے، جس کے پاس بات کرنے کو بیوی کے سوا اور کوئی موضوع ہی نہیں" دراصل اس مردانہ ذہنیت پر گہری تنقید ہے جو عورت کو محض اپنی جذباتی ضروریات کا ذریعہ سمجھتا ہے۔

> وہ دونوں تیسری منزل کے ایک کمرے میں تھے۔ یہ چھوٹا سا کمرہ اپنی ہلکی نیلی روشنی کے ساتھ باہر سے یوں دکھائی دیتا گویا ٹرین کا کوئی ٹھنڈا ڈبہ ہے، جس طرح ریلوے والے گرمی کے موسم میں "فردوس سیمیں" یا "خواب سیمیں" وغیرہ شاعرانہ نام رکھ کر بعض خاص گاڑیوں میں جوڑ دیتے ہیں۔ بارشوں کا زمانہ قریب قریب ختم ہو چکا تھا۔ مکانوں میں بسنے والی مخلوق نے پسینے، بدبو اور گھٹن سے نجات پائی تھی۔(۴)

افسانے میں عورت کی خرید و فروخت کا معاملہ جنس اور طبقاتی کشمکش کو ایک ساتھ پیش کرتا ہے۔ نوجوان کا "اس قدر روپیہ جمع کرنا کہ دو راتوں کے لیے اس عورت کو خرید سکے" اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ غریب عورت معاشی مجبوریوں کے تحت مرد کی ملکیت بن جاتی ہے۔ نسرین کی پھوپھی کا خاموش رہنا اور اسے اجازت دے دینا بھی اسی مجبوری کا حصہ ہے کہ غربت میں عورت کے پاس انتخاب کی آزادی نہیں ہوتی۔ یہاں جنس پرستی طبقاتی ناہمواری سے مل کر عورت کے استحصال کو مزید گہرا کر دیتی ہے۔ نوجوان کا متوسط طبقے سے تعلق اور نسرین کا غریب طبقے سے ہونا اس فرق کو واضح کرتا ہے کہ معاشی طاقت مرد کو عورت پر خریداری کا حق دے دیتی ہے، چاہے وہ خریداری جسم فروشی ہی کی صورت میں کیوں نہ ہو۔

> نجمہ بھی ٹھیک اسی طرح سیدھی مانگ نکالا کرتی۔" نوجوان نے کہا۔ "مگر کبھی کبھی وہ گدی تک مانگ لے جاتی۔۔۔ یہ طریقہ اس نے ایک بنگالن سے سیکھا تھا۔" نسرین چپ رہی، نظریں فرشی سنگھار میز کے آئینے پر جمائے جس میں اسے اپنا دھندلا دھندلا نیلگوں عکس دکھائی دے رہا تھا، وہ بالوں میں کنگھی کرتی رہی، جیسا کہ سونے سے پہلے بعض عورتوں کی عادت ہوتی ہے۔ نوجوان اس کے پاس ہی چاندنی پر کہنیوں کے بل اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ یوں لیٹنے سے اس کی سفید سلک کی قمیص اور خاکی زین کی پتلون میں جابجا سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔(۵)

نسرین کا کردار خاموش مزاحمت کی علامت ہے۔ وہ اگرچہ مجبور ہے، مگر اس کی خاموشی میں ایک احتجاج چھپا ہے۔ جب وہ نوجوان سے پوچھتی ہے کہ "وہ کیسی محبت تھی جو اس کے مرنے کے تین ہی مہینے بعد رفو چکر ہو گئی"(۶) تو یہ سوال مرد کی جذباتی سطحیت اور بے وفائی پر گہری تنقید ہے۔ نوجوان کا یہ کہنا کہ وہ اپنی بیوی سے بے حد محبت کرتا تھا، مگر اس کی موت کے تین ماہ بعد ہی وہ کسی اور عورت کو خرید رہا ہے، اس کی محبت کے دعوے کو بے معنی بنا دیتا ہے۔ نسرین کا یہ طنز دراصل اس مردانہ منافقت کی نشاندہی ہے جو ایک طرف بیوی کی یاد میں مرا جا رہا ہے اور دوسری طرف اسی یاد کی تسکین کے لیے دوسری عورت کو استعمال کر رہا ہے۔

افسانے کے آخر میں جب مرد کردار اپنی کمزوری سے پردہ اٹھاتا ہے کہ اس کی بیوی بے وفا تھی، تو صورتحال یکسر تبدیل ہو جاتی ہے۔ اب نسرین کو اس مرد کی اصل حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک ایسی عورت سے محبت کرتا رہا جو اس کے قابل نہ تھی، اور اس کے باوجود وہ اسے چاہتا رہا۔ اس انکشاف کے بعد نوجوان سوتے میں سسکی لیتا ہے اور تیز تیز سانس لینے لگتا ہے۔ یہاں نسرین کا ردعمل انتہائی اہم ہے۔ وہ بچے کی طرح اسے اپنے بازو میں لے کر چمٹا لیتی ہے۔ یہ عمل محبت یا جسمانی کشش نہیں ہے، بلکہ عورت کی فطری ہمدردی اور شفقت ہے جو مرد کی کمزوری دیکھ کر ماں بن جاتی ہے۔ یہ وہ المیہ ہے کہ عورت چاہے کتنی ہی زچ کیوں نہ ہو، مرد کی کمزوری پر اس کا نسائی جذبہ جاگ اٹھتا ہے اور وہ اسے سکون دینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اس افسانے میں ایک طرف مرد کی نظر کا غلبہ ہے جو عورت کو شے اور دوسری عورت کا متبادل بنا دیتا ہے، دوسری طرف نسرین کی خاموش مزاحمت اور نسائی جذبات کی بھرپور عکاسی ہے۔ غلام عباس یہ سوال اٹھاتا ہے کہ کیا عورت محض مرد کے جذباتی استحصال کا ذریعہ ہے؟ کیا اس کی اپنی شناخت، خواہشات اور جذبات کی کوئی قیمت نہیں؟ اور کیا مرد کی کمزوری عورت پر اضافی بوجھ ڈالتی ہے کہ وہ ماں بن کر اسے سکون دے؟ افسانے کا اختتام علامتی ہے۔ نسرین نوجوان کو اپنے بازو میں لے لیتی ہے، مگر یہ عمل اس کی عورت ہونے کی فطرت کا حصہ ہے، نہ کہ اس کی خواہش کا۔ یہی وہ المیہ ہے جو جنس نگاری کے حوالے سے افسانے کو گہرائی عطا کرتا ہے۔

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

غلام عباس کے ان دونوں افسانوں میں جنس کا تصور اپنی روایتی اور متعینہ معنوں میں موجود نہیں ہے، بلکہ وہ اسے ایک علامتی اور معاشرتی تناظر میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں جنس کا اظہار یا تو عورت کے نسائیتی احساسات اور اس کی ذات سے جُڑا ہوا ہے، یا پھر طوائف کی مجبوریوں اور معاشرتی جبر کی عکاسی کرتا ہے۔ اس طرح غلام عباس جنس کو محض جسمانی تسکین کا ذریعہ نہیں بناتے، بلکہ اسے انسانی جذبات اور معاشرتی حقائق کے تناظر میں ایک گہری معنویت عطا کرتے ہیں۔ غلام عباس کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ جذبوں کے حقیقی تخلیق کار ہیں اور ان کے افسانوں میں انسانی جذبوں کی عظمت پوشیدہ ہے۔ وہ جنس اور جذبات کے باہمی رشتے کو نہایت برجستگی اور گہرائی سے پیش کرتے ہیں، جس میں سطحی پن کی بجائے کرداروں کی داخلی کیفیات اور ان کی مجبوریاں نمایاں ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے محض تفریحی نہیں رہتے بلکہ قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور ان کے کردار اپنی جذباتی پیچیدگیوں کے ساتھ دیرپا تاثر چھوڑتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ غلام عباس، کلیات غلام عباس، کاروانِ ادب، کلکتہ، ۲۰۱۶، ص ۲۱۲

۲۔ ایضاً، ص ۲۲۲

۳۔ ایضاً، ص ۲۲۸

۴۔ ایضاً، ص ۲۳۸

۵۔ ایضاً، ص ۲۴۶